عدیل عباس

ایم فل اسکالر (اُردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ادب اور سماج میں مزاحمت کا کلامیہ

Adeel Abbas

M.Phil Scholar (Urdu), Punjab University, Lahore

Discourse of Resistance in Literature and Society

ABSTRACT

Resistance is derived from the Arabic word 'Zahma' which means obstacle or opposition. As a term Resistance means protest and practical struggle against all kinds of oppression. Literature itself is a resistance act, so such literature which seems to be an expression of Prevention, libertarianism, protest, rebellion, defection, revolution or any such spirit will be called resistance literature. In such a case, it would not be wrong to say that there are as many types of resistance in the world as there are types of oppression. The article under consideration covers the discourse of resistance in literature and society.

Keywords: *Resistance, Prevention, libertarianism, protest, rebellion, defection, revolution, discourse*

مزاحمت کے لفظ سے جو مفاہیم سامنے آتے ہیں وہ احتجاج، اختلاف، رکاوٹ، مخالفت یا انقلاب کے ہیں۔

مزاحمت عربی زبان کے لفظ 'زحمہ' سے مشتق ہے اور اس کے لغوی معنی مدافعت، مخالفت یا حریف سے ٹکرانے کے ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ (1) روک، تعریض، اڑکاؤ، ممانعت، روک ٹوک جب کہ اُردو لغت (تاریخی اصول پر)(2) کے میں روکنے والا، مزاحمت کرنے والا درج ہیں۔ انگریزی زبان میں Prevention/Preventive کے الفاظ مزاحمت کے مترادفات کے طور پر ملتے ہیں۔

"مزاحم/مزاحمت

Muzahim, forbidding, hindering; an obstacle, a preventive, a Preventer; adj-inconvenient, Muzahamat, prevention" (3)

Article (1-1-6) Published on 28-12-2023

Tashkeel, Department of Urdu, University of Jhang, E mail: tashkeel@uoj.edu.pk

12KM, Chiniot Road, Jhang, Punjab, Pakistan. 047-7671240

اسی طرح اوکسفورڈ انگلش اُردو ڈکشنری میں Preventive کے معنی مدافعت اور روکنے کی معنوں میں ہی نظر آتے ہیں:

"Preventive / Pri-Ventaiv/ adj. & n

صفت: مانع، روکنے، مدافعت کرنے والا، خصوصاً مرض، خلل یا خرابی وغیرہ کی ---اسم: مانع، حائل، دافع وسیلہ، تدبیر، دوا وغیرہ۔"(4)

علاوہ ازیں اِس خیال سے انگریزی کے جو الفاظ ذہن میں آتے ہیں یا اکثر اُردو سے انگریزی لغات میں دیکھے جاسکتے ہیں Resist یا Resistance کے ہیں جن کا مطلب مزاحمت ہی ہے۔ Oxford Urdu-English Dictionary کے مطابق:

"مُزاحم

/muza:him/ adj.obstructing,hindering,impediment,

resistant.n.m.1 obstacle, hindering, impediment, resistance." (5)

اردو اور انگریزی کی مستند لغات کی روشنی میں مزاحمت کے مفاہیم و معانی سامنے آنے پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لفظ مزاحمت Resistance لغت کے اعتبار سے ایک عربی، مونث اسمِ کیفیت ہے جس کے معنی کسی کام میں ممانعت، رکاوٹ یا روک تھام کے ہیں۔ لیکن اِس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ایک ہی لفظ کے معنی با اعتبار نفسِ مضمون، یا با اعتبارِ علم مختلف ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ فزکس یا اوہم لاء کی سائنس کے مطابق مزاحمت کا مطلب "کرنٹ کے بہاؤ میں پیش آنے والی رکاوٹ" جب کہ ادب یا سماجی علوم میں مزاحمت کے یہ معنی ہر گز نہیں ہو سکتے اِس لیے ہم لفظ کے اصطلاحی معنوں یا ادب و سماجی علوم میں اِس کے مفصل معنوں یا اِس اصطلاح کی تعریف کو دیکھیں گے۔

کوئی بھی انسان جبر و استداد یا اپنے ماحول کے غیر انسانی رویوں کے خلاف جو آواز بلند کرتا ہے وہ مزاحمت کہلاتی ہے، تحریر، تقریر یا مشتعل ہونا اِس کی کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے۔ ادب کے طالبِ علم کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اصطلاحی معنوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایسے رویوں کے خلاف قول و تحریر کو جو اِنسان کی فطری آزادی کو ختم یا محدود کرنے کی سعی کریں مزاحمت کہا جا سکتا ہے۔ ادیب بنیادی طور پر ایک باغی کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ آغاز تا حال ہر ادیب کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں مزاحمت ضرور پائی جاتی ہے۔

مزاحمت کی اصطلاح کے استعمال کو دیکھا جائے تو یہ پہلی دفعہ دوسری جنگِ عظیم میں مستعمل پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر طارق کلیم Encyclopedia britannica کو حوالہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مزاحمت کا لفظ اِس وقت منظر عام پر آیا جب جنگِ عظیم دوئم میں یورپ کے بہت بڑے حصہ پر جرمنی نے قبضہ کر لیا۔ مقبوضہ علاقوں میں رہنے والوں نے خفیہ طور پر غاصب جرمن فوجوں کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ اس عمل کو مزاحمت قرار دیا گیا اور ان لوگوں کی تحریک کو مزاحمتی تحریک کا نام دیا گیا۔ یوں یہ اصطلاح منظرِ عام پر آ گئی۔"(6)

انقلاب فرانس ہو یا، انقلابِ روس، برصغیر میں آزادی کی جدوجہد ہو یا چین میں ماؤزے تنگ سے وابستہ تحریک، ایران میں امام خمینی کی زیرِ قیادت اسلامی انقلاب ہو یا افغانستان میں ہونے والی خونی جنگ، ملکِ پاکستان میں لگنے والے مارشل لا سے لے کر حالیہ دہشت گردی اور سیاسی عدم استحکام ان سب تحریکوں یا بدلتے سماجی منظر نامے نے عام فرد اور بالخصوص ادیب طبقے کو قلم اُٹھانے پر مجبور کیا اُور اِس جذبے کے تحت تخلیق ہونے والا ادب مزاحمتی ادب کی مثال بنا۔ نامور محققین اور ادیبوں نے لفظ مزاحمت کے مفہوم کے حوالے سے بحث کی ہے۔ پروفیسر بختیار حسین صدیقی اپنے مضمون "سارتر کی داخلیت کا خارجی پس منظر" میں لکھا ہے: مزاحمت (Resistance) کی تحریک کا اہم پہلو زیرِ زمین کام کرنے والوں کی خاموش تنہائی نہیں، بلکہ اتحادِ عمل اس کا جوڑ ہے۔(7)

تاریخی یا سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان مزاحمتی تحریکوں کا اثر براہ راست ادب پر بھی ہوا۔ ادب میں خاص طور پر وجودی فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والے ادیبوں نے مزاحمت کو قابلِ ذکر اہمیت دی۔ قاضی قیصر الاسلام بیان کرتے ہیں:

"مزاحمت اِنسان کی اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی شدید خواہش کا اظہار یہ ہے۔ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ اسے یہ قبول نہیں کہ اُس کا حق کوئی دوسرا لے جائے۔ مزاحمت زندگی کی علامت ہے۔ زندہ اِنسان اپنی مرضی سے جینے کی خواہش رکھتا ہے۔ وجودی فلسفے کے پیروکار تو مزاحمت کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ جو مزاحمت نہ کرے اسے انسان ہی تسلیم نہیں کرتے۔"(8)

اِس طرح ڈاکٹر انوار احمد مزاحمتی شاعری کی بابت اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"اصطلاحاً مزاحمتی ادب ہمیشہ شعوری کاوش کا نتیجہ اور انسانی جدوجہد کے مثبت رخ کا آئینہ قرار دیا جاتا ہے۔ تخلیق کار انسان ضمیرِ شرفِ آدمیت کی سب سے بڑی دلیل ہے جبکہ غلامی کی ہر صورت سیاسی، معاشی، فکری اور ثقافتی انسانیت کی تذلیل ہے یہی وجہ ہے کہ ہر شعور یا باضمیر تخلیق کار فطرتاً آزاد ہوتا ہے اور غلامی مسلط کرنے کی ہر صورت اور ہر کوشش کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔"(9)

روبینہ سہگل کے خیال میں کسی بھی ظلم کے سدِباب کے لیے اُٹھ کھڑے ہونا مزاحمت شمار ہوتا ہے:

"مزاحمت ہر ایسے عمل، سوچ رویے یا طریق کار کو کہا جا سکتا ہے جو کسی نہ انصافی، ظلم، تشدد، بر بریت یا جبر کے خلاف کیا گیا ہو۔ مزاحمت سے مراد ہے کسی چیز کو روکنا، کسی ظلم کی مخالفت کرنا، کسی نا انصافی کو برداشت کرنے سے انکار کرنا اور متحرک انداز میں کسی ظلم کا سدِ باب کرنا۔"(10)

نعیم بیگ اپنے ایک مضمون "مزاحمتی ادب اور اِس کی تشریحات" میں مزاحمت کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"مزاحمت در حقیقت اُن آزاد سماجی و ثقافتی رویوں کے جبری استحصال سے انکار کا نام ہے جو سیاسی و عمرانی دباؤ کے تحت انسانی زندگی میں در آتا ہے۔"(11)

ڈاکٹر ابرار احمد اپنے مضمون "مزاحمتی ادب" میں مزاحمت پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تخلیقِ ادب بذاتِ خود ہی مزاحمت ہے اور ہر ادیب ہی باغی ہے۔ اُن کا کہنا ہے:

"ادب کی تخلیق کرنا، بذاتِ خود ایک مزاحمتی عمل ہے کیوں کہ ادیب اپنے گرد و پیش سے CONFORM نہیں کر پاتا اور اس کشمکش کی بنیاد پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے۔ ایک طرح سے تو سارا ادب مزاحمتی ہے اور ہر ادیب باغی:

میں تو یہاں گانے آیا ہوں
اور چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ گاؤ

پابلو نیرودا جب یہ کہتا ہے تو دراصل وہ کھل کر سانس لینے کی بات کرتا ہے۔ چند روز زندگی کو آزادی سے بسر کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس دنیا کو ایک آرام دہ اور پر سکون گھر کی طرح دیکھنا چاہتا ہے لیکن یہ آزادی کہاں ہے؟"(12)

مندرجہ بالا توضیحات سے یہ بات واہوتی ہے کہ جب سے انسان کے لکھنے کا آغاز کیا ہے یا یوں کہا جائے کہ جب سے ادب تخلیق ہونا شروع ہوا ہے مزاحمت کا سفر ساتھ ساتھ ہے کیوں کہ تخلیق کرنا بذات خود ایک مزاحمتی رویہ ہے۔ اِس لیے کوئی بھی ادیب اُس وقت تک ادب تخلیق نہیں کر سکتا جب تک اُس میں مزاحمت کا مادہ نہ پایا جائے۔

اِس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ مزاحمت خالصتاً فطری رویہ ہے۔ نا صرف انسان بلکہ کائنات کی ہر ایک شے اپنے وجود کی جنگ لڑ رہی ہے۔ کائنات کے ارتقا پر غور کیا جائے تو جس وجود نے اپنی بقا کے لیے مزاحمت کا رویہ اختیار نہیں کیا وہ دنیا سے ختم ہوتا چلا گیا۔ آفرینشِ جہاں سے لے کر اب تک کتنے ہی جاندار ہوں گے جن کا وجود اب دھرتی پر ناپید ہو چکا ہے۔ یقیناً وہ اپنی بقا کے لیے درکار مزاحمت نہ کر سکے اور آج وہ قصہ پارینہ ہو چکے ہیں۔

ارض و سماوات میں پائے جانے والی ہر اک شے، ہر گروہ، ہر ایک نوع اپنا وجود بر قرار رکھنے کے لیے اِس مزاحمت کی محتاج ہے۔ سائنسی اعتبار سے دیکھا جائے تو دنیا میں جو اشیا بھی پائی جاتی ہیں مثلاً جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں سے ہر ایک شے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے ہر ایک کو دھرتی پر اپنا وجود بر قرار رکھنے کے جس جذبے کی ضرورت ہے وہ مزاحمت ہی ہے۔ جمادات، نباتات اور حیوانات کو دیکھیں تو اِن کی ان گنت انواع بنی نوع انسان کے با شعور ہونے اور باقاعدہ علوم و فنون پر گرفت حاصل کرنے سے پہلے ہی مفقود ہو چکی ہیں۔ جمادات و نباتات کو اگر مزاحمت درکار ہے تو وہ محض کائنات میں ہونے والے تغیر و تبدل اور بالخصوص موسمی و جغرافیائی حالات سے جبکہ حیوان اور انسان ایسی انواع ہیں جن کو نہ صرف بدلتے ہوئے موسم اور تغیرِ کائنات سے بلکہ اپنے جیسی انواع سے بھی اِن کی بقا کو خطرہ لاحق ہے۔ کرہ ارض پر جیسے جیسے انسانی وجود نے ارتقا پایا اِس کے ساتھ ہی انسان کے اِس فطری جذبے یعنی مزاحمت نے ارتقا پایا۔ انسان نے موسم کے ساتھ ساتھ دوسرے انسان سے اور پھر قبیلوں نے دوسرے قبیلوں سے بچنے کی سعی کی۔ دنیا میں کم و بیش ہر جگہ لاتعداد خونی جنگیں ہوئیں اور ان گنت انسانی جانیں لقمہ اجل بنیں لیکن آج بھی اولادِ آدم کی تعداد روز بہ روز بڑھتی ہی جا رہی ہے اور تاوقت اِس نوع کے ناپید ہونے کے آثار نظر نہیں آتے لیکن اِن سب عوامل کے باوجود آج کے انسان کو جس قدر مزاحمت کی ضرورت تھی اِس سے پہلے شاید کبھی نہ ہو کیوں کہ اِس سے پہلے انسان کا مقصد صرف اپنا وجود بچانا تھا اور آج کا انسان وجود کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات بچانے کے لیے بھی مزاحمت کر رہا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو اور قومیں دوسری قوموں کو فکری سطح پر اپنا غلام بنا کر اُس کے نظریے اور فکر کو مفقود کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی باشعور انسان ایسا نہیں ہے جو اپنے ساتھ اپنے نظریے کی بقا نہ چاہتا ہو۔ ہر انسان شعور و ادراک رکھتا ہے وہ اپنے حواس پر ماحول کا اثرات کو محسوس کرتا ہے اور باشعور سماجی عوامل اور محرکات سے متاثر ہوتا ہے۔ ایسے میں انسان مزاحمت کے لیے خود کو تیار کرتا ہے وہ سوچتا ہے کہ وہ اِس جبر یا زیادتی کا نشانہ کیوں بنے۔ وہ اچھے برے کا امتیاز کر سکتا ہے اور اپنے ارد گرد کے ماحول کی پوری طرح پرکھ رکھتا ہے۔ ایک باشعور انسان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی بقاء کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا کیوں کہ اُس کی بقا و نشو و نما اور اُس کا وجود مزاحمت کے باعث ہی ممکن ہے۔

آج کے معاشرے کو دیکھا جائے تو انسان کو اپنی بقا کے لیے مزاحمتی رویہ اختیار کرنا ناگزیر ہے اِس وقت انفرادی و اجتماعی سطح پر انسان استحصال کا شکار ہے۔ قومیں اپنے سے کمزور قوموں اور انسان اپنے سے کمتر انسان پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اُسے اپنے کھیت کے بیل کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ایسے ہی کسی معاشرے کے لیے برطانوی ماہر نفسیات رونالڈ یوڈ لینگ (R.D Laing) نے لکھا ہے:

"ہر انسان اس سماج میں دوسرے انسان پر کنٹرول حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے وہ ہر وقت اِسی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ یہاں تمام باہمی تعلقات کا انحصار اِس بات پر ہوتا ہے کہ کسی طرح دوسرے انسان پر کنٹرول حاصل کیا جائے تاکہ اُس سے زیادہ سے زیادہ مُفاد حاصل کیا جا سکے۔ یعنی انسان کی حیثیت اُس بیل کی رہ جاتی ہے کہ جب تک طاقت ور اور کار آمد ہوتا ہے۔ تب تک کسان اُس کا اور اُس کی خوراک کا خیال رکھتا ہے لیکن جب بوڑھا اور کمزور ہو کر نا قابلِ استعمال ہو جاتا ہے تو کسان اُسے فروخت کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اِس طرح کے معاشرے میں وہی فرد ذہنی طور پر نارمل سمجھا جاتا ہے۔ جو سدھائے ہوئے جانوروں اور حرکت کرتی ہوئی مشینوں کی طرح کام کرتا رہے اور اکثریت سے انحراف کر کے اس کے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔"(13)

انسان فطری طور پر آزاد پیدا ہوا ہے اور وہ آزادی کو ہی پسند کرتا ہے۔ وقتی جبر و بے انصافی کو کسی وجہ سے انسان برداشت کر بھی لے پھر بھی اِنسان کے وجود سے خوئے آزادی ختم نہیں ہوتی۔ کرۂ ارض پر پاکستان سمیت کئی ایسے ممالک ہیں جنھوں نے آزادی کے لیے جنگ لڑتے ہوئے قربانیاں دی اور آخر کار اپنے آزاد وجود کے ساتھ دنیا کے نقشے پر ابھریں۔ اسی طرح کشمیر، افغانستان اور فلسطین سمیت کئی اقوام آج بھی حقِ خود ارادیت کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ انسان کی فطرت میں آزادی کی خُو اُس کو قید کی زندگی میں قرار نہیں پانے دیتی۔ امریکی ماہر نفسیات ایرک فرام (Erich Fromm) کے بقول:

"It is true that every human being adapts to his environment. But man is not a blank piece of paper that any society can write whatever he wants on it. The desires for personal happiness, love and freedom were instilled in him by nature. When a person does not take practical steps to fulfill his desires for personal happiness, love and freedom, he deviates from his nature and deviating from nature is a sign of abnormality of the individual."(14)

ماہرین نفسیات کے مطابق اپنے حق کے لیے آواز اُٹھانا اپنی بقا کی جنگ لڑنا اور شخصی آزادی پر کسی جبر یا قدغن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا یعنی مزاحمت کے جذبے کو قائم رکھنا اِنسان کے باعقل و باشعور اور نارمل ہونے کی نشانی ہے۔ جو لوگ ایسا کچھ نہیں کر پاتے اور اپنے آپ کو معاشرتی جبر کے حوالے کر کے خود کو بری ذمہ جانتے ہیں

اور استعمار کے ہاتھوں استحصال برداشت کرتے رہتے ہیں اور مزاحمت کرنے کی بجائے فرار، خود فریبی یا یاسیت میں پناہ تلاش کرتے ہیں ایسے لوگ نفسیاتی حوالے سے نارمل نہیں ہوتے۔

انسان اک معاشرتی حیوان (Social animal) ہے۔ سماجی روابط کی وجہ سے ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔ ایسے میں سماجی قوانین کی حد تک تو وہ قدغن بھی برداشت کرلیتا ہے اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے لیے قربانی کا جذبہ بھی رکھتا ہے تاہم جب وہ محسوس کرتا ہے کہ تعلقات کی آڑ میں لوگ اپنے مفادات کو تعلق پر ترجیح دے رہے ہیں یا معاشرے میں رائج قانون طبقاتی تقسیم کی بھینٹ چڑھ کر امیر کے مفاد میں جب کہ غریب کا استحصال کر رہا ہے تو ایسے حالات میں عام انسان کا مزاحمت کرنا اُس کے نارمل ہونے کی دلیل ہے۔

مزاحمت کے یہ معانی تو واضح ہیں کہ جب انسان غیر انسانی رویوں اور معاشرتی ناہمواری کے خلاف فطری ردِ عمل ظاہر کرتا ہے تو ہم اِس کو مزاحمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ عمومی ردِ عمل یہی ہوتا ہے کہ ہم اپنے قول و فعل کے ذریعے اپنے خلاف ہونے والے عوامل کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن جب احتجاج کے باوجود ناہمواری ہماری برداشت سے بڑھ جاتی ہے تو مزاحمت ہماری تحریر و تقریر میں احتجاج بن کر ابھرتی ہے۔ بے شک احتجاج کی بنیاد مزاحمت پر ہی ہوتی ہے لیکن احتجاج مزاحمت سے شدید رویہ جانا جاتا ہے۔ فیروز الغات (15) کے مطابق احتجاج کے لغوی معنی: اِعتراض، حجت، انکار، مخالفانہ آواز، اَظہار ناپسندیدگی اور پروٹیسٹ جب کہ اصطلاحی معنی کسی خاص گروہ یا فرد کی کسی نا پسند بات کے خلاف، تقریراً یا تحریراً ناراضی کا اظہار احتجاج کے ہیں، جِس کے لیے ہم انگریزی میں پروٹیسٹ (Protest) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

اوکسفورڈ اُردو انگریزی لغت (16) میں بھی احتجاج کے لیے لفظ پروٹسٹ (Protest) ہی درج ہے ادب میں احتجاج اُس وقت کیا جاتا ہے جب ادیب اُن حالات و واقعات کا تجزیہ کرتا ہے جو اُس زمانہ کو درپیش ہوتے ہیں چوں کہ وہ اِسی زمانہ وقت میں رہ رہا ہوتا ہے تو لازماً اُن حالات و واقعات کا اثر ادیب پر بھی پڑتا ہے اور ادیب ایسے ناآسودہ حالت میں اظہارِ ناآسودگی یا انکار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پروفیسر محمد حسن احتجاج کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "سماجی حقیقت اس کے لیے ایک ایسا بھاری پتھر ہے جسے وہ اُٹھا تو نہیں سکتا اُس سے سر ٹکرانے کی جرات البتہ ضرور کر سکتا ہے۔ وہ تو محض سوالیہ نشان پیدا کرنے کی ہمت کر سکتا ہے۔۔۔ احتجاج پوری طرح یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے اس کی تکمیل کے لیے کون سے ذرائع اور وسائل اختیار کیے جانے چاہیے البتہ وہ اتنا ضرور جانتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس سے ناآسودہ ہے۔"(17)

چناں چہ اثرات اُس کی تخلیقات میں بھی در آتے ہیں اوراِس میں وہ ایک احتجاج کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔جب ایک حساس ادیب معاشی، اقتصادی، سیاسی، مذہبی یا سماجی سطح پر غیر منصفانہ رویوں کی ترویج دیکھتا ہے تو اُس ذہن میں اِس کے خلاف ایک ممانعت پیدا ہوتی ہے جس کے پیچھے مزاحمت کا رویہ کار فرما ہوتا ہے۔جس عمل کے ردِ عمل کی صورت میں مزاحمت جنم لیتی ہے اُس عمل میں شدت مزاحمت کواحتجاج کی طرف لے جاتی ہے۔احتجاج شخصی و انفرادی سطح پر بھی ہو سکتا ہے اور اجتماعی بھی لیکن احتجاج بھی ایک حد رکھتا ہے کسی ایک طبقے سے چند افراد کے گروہ کی مضبوط و جارہانہ مزاحمتی آواز احتجاج ہو سکتی ہے بغاوت نہیں، بغاوت مزاحمت کا احتجاج سے بھی آگے کا درجہ ہے کیوں کہ جب احتجاج سے مسائل کا ممکنہ حل نہیں نکل پاتا تو پھر احتجاج بغاوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

"بغاوت کے لغوی معنی دیکھیں تو وہ سرکشی، نافرمانی، سرتابی، بلوہ یا غداری وغیرہ کے ہیں، کسی بھی حکومت کے خلاف اجتماعی طور پر قانون شکنی، ایجی ٹیشن، بلوہ، لوٹ مار، تشدد، فساد بھی انہی معنوں میں آتا ہے۔"(18)

اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت میں Revolt یا Rebellion کے الفاظ بغاوت کے طور پر مستعمل ملتے ہیں۔

"بغاوت

/bega: vet/ N.F. revolt, rebellion, mutiny, treason" (19)

بغاوت ہمیشہ حزب اقتدار کے خلاف ہوتی جنھوں نے کسی سطح پر بھی اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہو یہ انفرادی سطح پر کسی ایک انسان کی منشا سے نہیں ہوتی بلکہ اِس میں بڑے بڑے احتجاجی گروہ ہوتے ہیں جو باہم مل کر کسی ایک بغاوت کو جنم دیتے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی ملک میں مختلف جگہوں پر مختلف مزاحمتیں بہ صورت بغاوت پنپ رہی ہوں جن کے محاذ مختلف ہوں جب کہ مختلف جگہوں سے سر اُٹھانے والی چھوٹی چھوٹی بغاوتوں کا اختلاف و مزاحمت کسی ایک محاذ کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔

عام احتجاج کی نوعیت ایک خاص حد تک کی مزاحمت ہوتی ہے لیکن جب کسی گروہ یا معاشرے کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو اُس کے لیے مزید برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ جیسے مزاحمت ایک فطری رویہ ہے اُسی طرح شدید ترین ناساز و غیر منصفانہ حالات میں بغاوت کا جنم لینا بھی ایک فطری عمل تصور ہوگا۔

بغاوت اُس وقت جنم لیتی ہے جب لوگوں پر ظلم و ستم حد سے بڑھ جاتا ہے اور اُن کے بنیادی حقوق کو پامال کیا جا رہا ہو اُن کی بنیادی اشیائے ضرورت کا حصول ناممکن بنا دیا گیا ہو یا لوگوں کی سوچ پر پہرے بیٹھا دیئے گئے ہوں۔سچ بولنے پر پابندی اور جھوٹ کا دور دورہ ہو لوگوں کی عزتِ نفس مجروح ہو رہی ہو تو اِس صورت میں بغاوت اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے۔بغاوت لوگوں کا ایک گروہ یا وہ طبقہ استحصالی قوتوں کے خلاف کرتا ہے اور یہ اِستحصالی قوتوں کے خلاف ایک

منظم مزاحمت کی صورت ہوتی ہے۔ یہ کوئی زیرِ زمین تحریک نہیں ہوتی جس کا علم لوگوں کو نہ ہو اور نہ ہی یہ کوئی پوشیدہ جدوجہد ہوتی ہے۔ بغاوت ایک خاص نہج پر پہنچ کر انقلاب کو جنم دیتی ہے۔ بغاوت سے اگلا درجہ انقلاب کا ہوتا ہے۔ انقلاب ایک خاص تبدیلی کا نام ہے۔

> "اِنقلاب (ان۔ قِ۔لاب) (ع۔ا۔مذ) (۱) تغیر و تبدل۔ گردش۔ دَور (۲) زمانے کا چکر کھانا، نیرنگ، زمانہ (۳) بنیادی تبدیلی۔ حکومت کی تبدیلی جو عوامی طاقت کے ذریعے لائی گئی ہو۔(Revolution)۔"(20)

انقلاب کی ابتدا بے شک مزاحمت کے فطری جذبے کے تحت ہوتی ہے لیکن انقلاب ممانعت، رکاوٹ یا انکار کے عمومی معنوں سے بہت آگے کا درجہ ہے۔ انقلاب کے لیے انگریزی میں Revolution کا لفظ استعمال ہوتا ہے Lexicon Universal Encyclopedia میں اس کی وضاحت کچھ اس انداز میں کی گئی ہے :

> "Revolution seeks to achieve extensive change in social and political system in place of the old order, with its emphasis on status and privilege, for instance, it may seek a society that values social equality, individual achievement, and political participation based on participation and mobilization. In particular, it supports greater equality of economic conditions...and involves fundamental hanges in the structure of a society, its basic beliefs and individual behavior"(21)

عمومی طور پر دیکھا جائے تو مزاحمت، احتجاج، بغاوت اور انقلاب ایک جیسے رویے معلوم ہوتے ہیں۔ بے شک لغوی معنی کی سطح تو ان کے مفہوم قریب ہیں لیکن اِن لفظوں کی گہرائی و گیرائی اور حقیقت کو باریک بینی سے پرکھا جائے تو یہ مدارج ہیں جن کے پیچھے مزاحمت کا فطری رویہ کارفرما ہوتا ہے۔ مزاحمت ہی کا حتمی درجہ انقلاب ہے۔ دنیا میں رونما ہونے والے تمام انقلابات کے پیچھے جو جذبہ متحرک نظر آتا ہے وہ مزاحمت ہی ہے جو مزاحمت سے احتجاج، احتجاج سے بغاوت اور آخر کار بغاوت انقلاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ادب میں یہ تمام اصطلاحیں مروج ہیں۔ ڈاکٹر علی جاوید ان اصطلاحوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "انقلاب احتجاج اور بغاوت ایک دوسرے کے قریب ضرور ہیں لیکن ان میں بہت فرق ہے، جہاں تک انقلاب کا تعلق ہے تو اسے لوگوں نے کئی معنوں میں استعمال کیا ہے لیکن اگر انقلاب کے سائنٹفک نقطۂ نظر کو دھیان میں رکھا جائے تو انقلاب کے معنی کسی سماج کی معاشیات

کے پیداوری رشتے میں مکمل تبدیلی یا دوسرے الفاظ میں کسی سماجی ڈھانچے میں مکمل سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلی کے ہیں۔ انقلاب کے لیے عمل پیہم ضروری ہے اور انقلاب کا تعلق کسی باقاعدہ تحریک سے ہوتا ہے جس کے مقاصد پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی انقلاب کے لیے انقلابی شعور کا ہونا لازمی ہے جبکہ احتجاج کسی بھی سماجی نظام یا تحریک سے ناراضگی کا ردِ عمل بھی ہو سکتا ہے۔۔۔۔ جس طرح انقلاب اور احتجاج میں فرق ہے ویسے ہی بغاوت اور احتجاج میں بھی معنوی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی نظام کے خلاف ٹکراؤ یا کسی بھی رسم یا رواج کے خلاف مہم کو بھی بغاوت کا نام دیا جا سکتا ہے، خواہ اس کی راہ انقلابی ہو یا جذبات کا وقتی ابال جو رومانوی اثرات سے پر ہو، جبکہ احتجاج کسے شے سے لاتعلقی یا ناراضگی کا اظہار ہے جو مقابلہ کی حد تک نہیں پہنچتا اور نہ ہی کسی ناپسندیدہ شے سے نجات پانے کا راستہ ہموار کرتا ہے۔"(22)

گویا مزاحمت، احتجاج، بغاوت یا انقلاب کے الفاظ معنوی اعتبار سے قریب ہونے کے باوجود اپنے الگ مفاہیم رکھتے ہیں۔ ادبی اصطلاح کے طور پر بھی دیکھا جائے تو یہ رویے ایک دوسرے کے قریب ہیں لیکن در حقیقت یہ مدارج ہیں جن میں تمام تر کی بنیاد مزاحمت کا فطری رویہ ہے۔ ویسے تو ادب کی تخلیق اپنے طور پر خود ایک مزاحمتی رویہ ہی ہے لیکن عالمی ادب یا اردو ادب میں بھی جو تخلیقات احتجاج، انحراف، بغاوت، انقلاب یا ایسے کسی بھی جذبے کا پیش خیمہ سمجھی جاتی ہیں اُن کی تخلیق مزاحمت ہی کا اظہار ہے۔ ڈاکٹر آغا ظفر حسنین اپنی کتاب مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری میں لکھتے ہیں:

"بلاشبہ احتجاج، انقلاب اور بغاوت کی اصطلاحیں مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف تصوارت کی حامل ہیں مگر بعض اوقات ادب میں ان تینوں کو ایک دوسرے کے مابدل کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی توجیہات بھی تقریباً وہی ہیں جو احتجاج اور مزاحمت کی interchangeability کے ضمن میں بیان کی گئی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی فن پارے یا تخلیق کو جب باغیانہ کہا جا رہا ہو تو اس سے کم از کم فن کار کا سخت اور شدت پسند آمیز موقف یا لہجہ تو مراد لیا ہی جاتا ہے۔ اِس طرح کسی فن پارے کو جب انقلابی کہا جاتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اِس میں معاشرتی تنظیم نو کے نقطہ ہائے دقیق پیش کیے گئے ہوں۔"(23)

اِس تمام تر بحث سے ہم یہ بات اخذ کر سکتے ہیں کہ اعتراض، انحراف، احتجاج، بغاوت، انقلاب یا ایسے دیگر جذبات کا عکاس جو ادب بھی تخلیق ہوتا ہے اُس کو ہم مزاحمتی ادب کہیں گے جب کہ انہی جذبات کی عکاس شاعری کو ہم مزاحمتی شاعری کہیں گے۔

آج کے انسان کے استحصال و کسمپرسی کی وجہ کسی ایک سبب کو نہیں گردانا جا سکتا۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، ریاستی اور استعماری طاقتوں کے ہاتھوں یرغمال انسان پہ جبر کا شمار کیا جائے تو اُس کی ان گنت وجوہات ہیں جس کے خلاف ہر انسان میں فطری مزاحمت پائی جاتی ہے۔ اس کا اظہار وہ مختلف طریقوں سے کرتا ہے اور کرتا چلا آرہا ہے۔ لہٰذا اگر بات مزاحمت کی اقسام کو شمار کرنے کی کی جائے تو ہم بلاخوف وتردد یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں ظلم و جبر کی جتنے طریقے رائج ہیں مزاحمت کی اقسام بھی اسی لحاظ سے ہوں گی۔ بقول آغا ظفر حسنین "ادب میں مزاحمت کی اتنی ہی قسمیں ہو سکتی ہیں جتنی کہ معاشرے میں جبر کی۔"(24) بنیادی طور پر مزاحمت کو جن اقسام میں تقسیم کرتے ہیں وہ ذیل ہیں۔

مزاحمت کی پہلی صورت ریاستی جبر سے متعلق ہے۔ بنیادی انسانی حقوق کی پاسداری دنیا کے ہر انسان کا اولین اور اہم ترین حق ہے۔ انسان فطری طور پر جن آزادیوں کے ساتھ پیدا ہوا ہے خود کو معاشرتی اقدار میں ڈھالنے کے لیے وہ چند ایک قربانیاں دیتا ہے لیکن جب ایک حد سے زاید اُس کے حقوق کو ریاستی قوانین کے نام پر سلب کیا جاتا ہے تو اُس کے خلاف وہ اپنا ردِ عمل ضرور ظاہر کرتا ہے۔ ان بنیادی حقوق کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، مداخلت یا ان کی پامالی ریاستی جبر کے زمرے میں آئے گی۔ دنیا کے تمام تر ممالک میں کلی نہیں تو جزوی سطح پر کسی نہ کسی طور ریاستی جبر ضرور دیکھنے کو ملتا ہے۔ بالخصوص غیر ترقی یافتہ مماملک یا ایسے ممالک جن کی ضروریات کا انحصار دوسرے ممالک پر ہو۔ اِس کے ساتھ ساتھ ایسے ممالک جن میں شہنشاہیت، فوجی آمریت یا نام نہاد جمہوری طرزِ حکومت رائج ہو وہاں حقیقی جمہوری نظامِ حکومت رکھنے والے ممالک کی نسبت ریاستی جبر کی مثالیں زیادہ واضح ہوں گی۔ اگر پاکستان کی بات کی جائے تو کئی اک مثالیں بڑی نمایاں صورت میں دیکھی جاسکتی ہیں مثلاً ملک کے چند مخصوص علاقائی، مذہبی، لسانی یا سیاسی گروہ کے جائز حقوق سے ریاست کی عدم توجہی؛ ذرائع ابلاغ، ادیبوں، دانشوروں اور عام عوام کو آزادی اظہارِ رائے کا حق نہ دینا؛ ریاست کے مفاد کے لیے مخصوص موقف کی تشہیر اور اِس کے مخالف رویوں کی حوصلہ شکنی کرنا؛ جمہوریت کی بجائے آمرانہ طرزِ حکومت سے براہ راست لوگوں کا حقِ رائے دہی کی تذلیل؛ عوامی انتخاباتی عمل اور جمہوری رویوں کے راہ میں روڑے اٹکانا؛ حزبِ اختلاف یا حقوق کے لیے آواز اُٹھانے والوں کو احتجاج کرنے سے روکنا اور اِن کو غدارِ ملک کہنا یہ تمام وہ جبر ہیں جس کا شکار کوئی اور نہیں بلکہ ریاست کے اپنے ہی شہری ہوتے ہیں ایسے تمام تر رویوں کے خلاف تحریراً یا تقریراً جو ردِ عمل بھی سامنے آئے گا وہ ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت شمار ہو گا۔

دوسری صورت سیاسی جبر سے متعلق ہے مگر اس کی نوعیت مختلف ہے۔ یہ سیاسی بد عنوانی کی صورت میں یا کسی مخصوص سیاسی لابی، کسی خاص طبقے کے مفادی نظریے کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ سیاست کا لفظی معنی تو حکومت کرنے کی حکمتِ عملی ہی ہو گا لیکن ہماری سیاسی تاریخ کو دیکھا جائے تو ہمارے بیشتر سیاست دانوں کی مصلحت کوشی نے

اس کو عیاری و مکاری کے معنوں کا لبادہ پہنا دیا ہے۔ آج کے سیاست دان کے اندر عوامی خدمت اور بہتر طرزِ حکومت چلانے کا خیال تک مفقود ہے۔ یہاں سیاست حکومت و اقتدار حاصل کرنے اور اپنی طاقت بڑھانے کے لیے حاصل کی جاتی ہے جس کے باعث عوام کے مسائل پر توجہ کی بجائے رشوت ستانی، ضمیر فروشی، اخلاقی تنزل، عیش پرستی، اقربا پروری، مذہبی و لسانی اور علاقائی تعصب ہماری سیاست کا طرہ امتیاز بن چکا ہے۔ یہ تمام عوامل سیاسی بدعنوانی شمار ہوتے ہیں۔ پھر آئے روز کھوکھلے نعروں اور روایتی وعدہ خلافیوں کے باعث عوام پر اِس بدعنوانی کا پردہ پوری طرح چاک ہو چکا ہے۔ ایسی صورتحال میں عوام میں سیاسی بدعنوانیوں کے خلاف شدید مزاحمتی ردِ عمل پائے جانا ایک فطری عمل ہے۔

ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ دنیائے عالم کے نقشے پر نظر دوڑائیں تو چند طاقتیں بصورت استعمار پوری دنیا کی سیاست پر غالب آئی ہوئی ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کو اپنی کالونیاں بنانا' اِس کے بعد نو آبادیات کا زوال، سوویت یونین اور امریکہ کے باہمی تصادم' سرمایہ درانہ نظام اور سوشلزم کے نعرے نے الگ الگ نظریے وضع کرتے ہوئے پورے گلوب کو تقسیم کر کے رکھ دیا۔ طاقت کے حصول کے لیے ہتھیاروں کی جنگ' پاکستان، افغانستان اور دیگر ممالک کے لوگوں کا استحصال اور پھر اِس تیسری عالمی جنگ کا سفر نظریات کی جنگ اور خاموش جنگ یعنی سیاسی سطح پر مکاریوں سے دوسروں کو زیر کرنے کے تصورات کو جنم دیا۔ آج پوری دنیا پر پانچ بڑی طاقتیں حکومت کر رہی ہیں 'سپر پاور' بننے کی جنگ میں ترقی پذیر قوموں کا سیاسی استحصال کیا جا رہا ہے۔ حقیقی جمہوری نظریات کے فروغ کی بجائے نام نہاد جمہوریت، سوشلزم کے نعروں اور دیگر لسانی و مذہبی سیاسی گروہ پیدا کرتے ہوئے اِن ممالک کو اندر سے کھوکھلا کیا جا رہا ہے۔ ایسے میں ایک باشعور انسان اِن سب عوامل کو دیکھتا ہے اور آنے والے وقت میں اپنے متزلزل مستقبل کے بارے میں نہایت فکر مند ہوتا ہے جس کی خاطر وہ مزاحمت کا اظہار کرتا ہے یہ مزاحمت انفرادی بھی ہو سکتی ہے اور احتجاج سے بغاوت اور آخر کار انقلاب کا رنگ بھی اختیار کر سکتی ہے۔

تیسری صورت مذہبی انتہا پسندی سے متعلق ہے۔ دنیا کے تمام تر مذاہب انسان کی فلاح و بہبود اور ایک مثالی معاشرے کے قیام کے لیے معرضِ وجود میں آئے ہیں تمام تر اَعمال و عبادات کا بنیادی مقصد انسان کی اخلاقی و معاشرتی تربیت ہے۔ لیکن مذہب کے نام نہاد ٹھیکے داروں نے اپنے مادی مفادات کی خاطر اِن عبادات کی اصل روح اور حقیقی مقصد کی بجائے ظاہر داری و ریاکاری کا وطیرہ اختیار کر لیا ہے۔ مثلاً ہندوؤں نے گنگا و جمنا کے غسل، ویدوں کے پاٹھ، گیروا لباس، دیوی دیوتاؤں کی آرتی اتارنے، عیسائیوں نے اتوار کے اتوار کلیسا جانے، اجتماعی عبادات، بائبل کی تلاوت اور صلیب چومنے تک خود کو محدود کر لیا۔ اِسی طرح ملاؤں نے حقوق العباد کا درس عام کرنے کی بجائے نماز و روزہ کے طریقوں، بنا سمجھے محض قرآن رٹنے اور سال بہ سال حج ادا کر کے سابقہ گناہ معاف کرنے کی چکر میں خلقِ خدا کو اُلجھائے رکھا اور تمام مذاہب نے اِن ظاہری عبادات پر عمل پیرا ہونے کو ہی عبادت جانا' عرفانِ الٰہی اور اِن عبادات

سے جڑے اصل مقاصد کو بھول کر ظاہر ریاکاری پر توجہ دی۔ اِس کے ساتھ ساتھ انسانی رواداری، بھائی چارے، امن و عافیت اور باہمی یگانگت کو یکسر نظر انداز کر کے مذہبی و مسلکی گروہ بندی نے تعصب کی فضا کو ہوا دی جس نے انتہا پسندی کو جنم دیا۔ یہ انتہا پسندی یہ تھی کہ اپنے مذہب و مسلک کے عقائد کو سب سے افضل ماننا اور دوسرے کے عقیدے کو کھوٹا اور گمراہ کن کہتے ہوئے اُس پر کفر کا فتویٰ صادر کرنا' نا صرف اُسے کافر کہنا بلکہ بات ایک دوسرے کی جان لینے تک آ چکی ہے۔ مذہب سے جڑے انسان دوست اور مثبت رویوں کو دنیا کا ہر باشعور ذہن نا صرف تسلیم کرتا بلکہ کسی نا کسی سطح پر اُس کی پیروی بھی کرتا ہے۔ لیکن وہ تمام عوامل جو نام نہاد دین داروں نے مذہب کے نام پر ریاکاری و انتہا پسندی کی صورت فروغ دیے ہیں ہر زمانے میں اُن کے خلاف مخفی و اعلانیہ مزاحمت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہندیوں میں آریہ سماج اور بھگتی تحریکیں جبکہ مسلمانوں میں فلسفہ تصوف کا پرچار اِس مزاحمت کا اظہار ہیں۔

چوتھی صورت معاشی جبر سے تعلق رکھی ہے۔ مزدور طبقہ کا معاشی استحصال، پیداور کے ذرائع کی غیر منصفانہ تقسیم، خود کار نامساعد معاشی حالات مثلاً بے روزگاری وغیرہ اِن تمام عوامل کو معاشی جبر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کی نصف سے زاید آبادی اور بالخصوص وہ ترقی پذیر ممالک جن کو ''تیسری دنیا'' جیسی اصطلاح سے پکارا جاتا ہے شدید معاشی جبر کا شکار ہیں۔ دنیا پر قابض استعماری قوتیں اور ملٹی نیشنل شراکتی کاروباری کمپنیاں دنیا کے تمام تر سرمایے پر قابض ہیں۔ تیل، گیس، معدنیات، ذرائع اجناس اور ایسی کئی نعمتوں سے مالا مال سرزمینیں بھی اِن ممالک کے پاس رہن رکھی ہوئی ہیں۔ اِس سے بڑھ کر معاشی جبر کیا ہو گا کہ عالمی منڈی میں تیل کی قیمتیں اور تیل کے کاروبار پر قابض قومیں بذات خود تیل پیدا نہیں کرتیں بلکہ دیگر ممالک سے حاصل ہونے والے تیل کے بھاؤ طے کرنے کی ذمہ داری انھوں نے اپنے پاس رکھی ہوئی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور دیگر ادارے بھاری سود و شرائط کے ساتھ عطا کردہ قرض کے ذریعے وہاں کے عوام کا استحصال کر رہے ہیں۔ بڑی طاقتیں کاروباری شراکت داریوں اور غیر منصفانہ معاہدوں کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کی معشیتوں کا دیوالیہ نکال رہی ہیں۔ معاشی جبر کی اِس سنگین صورتحال میں اِن تمام منفی حکمتِ عملیوں کے خلاف عوام میں مزاحمت کا پنپنا ایک فطری عمل ہے۔

مزاحمت کی پانچویں صورت کا تعلق تاریخی جبر سے ہے۔ آفرینشِ جہان سے لے کر اب تک جو کچھ ماضی میں ہو گزرا ہے ہم اُسے تاریخ شمار کرتے ہیں۔ بیشتر ناخوشگوار تاریخی واقعات انسان کے لیے غیر موزوں و ناپسندیدہ ہوتے ہیں جن کے خلاف مزاحمت کا اظہار کو اچنبھے کی بات نہیں۔ امن و آشتی کا درس دینے والے انبیا کے قتل ہو، واقعہ کربلا ہو، طاقت و حکومت کے حصول کے لیے ہونے والی قتل و غارت گری ہو؛ سوویت یونین کا ٹوٹنا ہو، عالمی جنگیں، تقسیم برصغیر پاک وہند، سقوطِ ڈھاکہ، افغان جنگ، نائن الیون ہو، عراق ایران جنگ، یا دنیا میں جاری حالیہ خانہ جنگی، یہ تمام تر تاریخ کے ابواب کی سیاہ حقیقتیں ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ امن کا متلاشی دورِ حاضر کا انسان کسی

صورت بھی اِن بھیانک واقعات کو دہرانا نہیں چاہتا۔ لیکن کچھ بھی ہو یہ تاریخی جبر ہیں جن سے انکار کی کوئی گنجائش موجود نہیں اِس لیے جب کوئی سوچنے سمجھنے والا انسان تاریخ کے اِن اوراق کو دیکھتا ہے تو ردِ عمل کے طور پر قول و فعل کے ذریعے مزاحمت کا اظہار کرتا ہے۔

ادبی جبر کے خلاف مزاحمت چھٹی صورت کہلاتی ہے۔شعرا و ادیب معاشرے کا حساس طبقہ ہوتے ہیں۔جہاں سیاسی، مذہبی، تاریخی، معاشی، معاشرتی، ریاستی جبر اور ناخوشگوار صورتحال کے خلاف ادیب مزاحمت کا اظہار کرتے ہیں تو وہیں ادب میں غیر موزوں رویے اور ادبی بد عنوانیاں اُس کی طبیعت پر گراں گزرتی ہیں جس کے خلاف وہ مزاحمت کرتا ہے۔ادبی تاریخ کو دیکھیں تو مزاحمت کی صورت پیدا ہونے والے اِس انحراف کی بدولت ہی ادب نے ارتقا پایا کئی نئے موضوعات اور ہیئتوں کی اختراع اِسی مزاحمت کی دین ہیں۔اِس کے علاوہ جہاں ادب کی آڑ ادبی بدعنوانیوں اور بے اعتدالیوں کو اختیار کیا گیا وہاں بھی ادیب اِس کے خلاف دیوار ثابت ہوئے اور بھرپور مزاحمت پیش کی۔کلاسیکیت سے انحراف کر کے رومانیت کی ابتدا، رومانیت کے جمود کو جدیدیت کے ساتھ توڑنا، غزل کی بجائے نظم کو ذریعہ اظہار بنانا اور پھر نظم میں آزاد نظم، نظمِ معریٰ سے لے کر نثری نظم تک کا سفر اِس رویے کے باعث ممکن ہوا۔ایہام گوئی اور سر سید تحریک کی مخالفت میں لکھے جانے والا ادب اور اُس کے مخالف اپنائے جانے والے رویے مزاحمت کے باعث ہی ادبی تاریخ کا حصہ بنے۔ادب برائے ادب پھر جواباً ادب برائے زندگی اور ترقی پسندیدیت کا فروغ اِن سب کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے مزاحمت و انحراف کے پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اِس کے ساتھ ساتھ آغاز تا حال ادیبوں کی مشکل پسندی پر چوٹیں، سرقہ و کلام چوری کرنے کا الزام، شاہ کا مصاحب ہونے کے الزام اور دیگر مفادات کی خاطر جن شعرا نے اقدار کی قربانی دی اُن کو دیگر شعرا کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔غالب نے اِسی رویے کے خلاف کہنا پڑا: "ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا"

مزاحمت کی ساتویں صورت تہذیبی و ثقافتی جبر کے خلاف مزاحمت ہے ۔کسی خاص علاقے یا گروہ کی شناخت 'اُن کی تہذیب و ثقافت یعنی زبان، رسم ورواج، طریقہ زیست، فنون لطیفہ اور دیگر مخصوص اقدار کے خلاف حقارت آمیز رویہ اختیار کرنا کسی جبر سے کم نہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے ہم جس خطۂ زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں اِس میں تہذیبی استحصال کی مستند مثالیں موجود ہیں۔برصغیر سمیت دنیا کی دیگر ترقی پسند قوموں پر جب فاتح اقوام نے حملے اور قبضے کیے تو نا صرف اُن کو جانی و مالی نقصان پہنچایا بلکہ اُن کی تہذیب و ثقافت کو بری طرح تاراج کیا۔ برصغیر کی تہذیب و ثقافت پر سب سے پہلے یونانی تہذیب پھر اسلامی اور بعد ازاں مغربی تہذیب نے حملے کیے۔جس کے باعث یہاں کی مقامی زبان، رسم ورواج اور فنون لطیفہ میں تغیر و تبدل واقع ہوا۔اس سے مقامی تہذیب کو نقصان پہنچا۔فاتح قوموں میں ایک رویہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے تہذیبی یلغار کے ساتھ مفتوح قوموں میں احساسِ کمتری پیدا کرنے

کے لیے اُن کو غیر ترقی یافتہ یا غیر مہذب ثابت کرنے کے لیے اُن کی ثقافت میں خامیاں اور نقائص نکالے جاتے ہیں۔ البیرونی کا کتاب الہند میں اور انگریز مورخین کا اپنی کتابوں میں ہندوستان کی تہذیب و ثقافت میں عیب نکالنا تہذیبی جبر کی مثالیں ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ ہندی کے مقابلے میں فارسی کو اور اُردو کے مقابلے میں انگریزی زبان کو علم وادب کی زبان گردانا نیز پنجابی یا دیگر علاقائی زبانوں کو کم تر اور حقیر کہتے ہوئے تذلیل کا رویہ رکھنا سنگین نوعیت کے جبر ہیں جن کے خلاف مختلف صورتوں میں مزاحمت دیکھنے کو ملتی ہے۔

معاشرتی جبر کے خلاف مزاحمت اس کی آٹھویں صورت ہے۔ مذہبی و ریاستی جبر کے علاوہ معاشرتی سطح پر رواچند نشیب و فراز ایسے ہیں جن میں معاشرہ ریاست اور مذاہب کے قوانین سے ہٹ کر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے مثلاً ذات پات، غیرت کے نام پر قتل، جہیز اور اِس جیسے کئی اک جبر ہیں جن کی کوئی ریاست یا مذہب چھوٹ نہیں دیتا۔ ہمارے معاشرے میں جہیز کی خاطر لڑکیاں اپنی عمریں گنوا دیتی ہیں۔ ہر میدان میں مرد کے مقابلے میں عورت کا استحصال ہونا، جائیداد میں حصہ نہ دینا، مرضی و منشا کے بغیر شادی کرنا، قرآن سے بیاہ دیا جانا، عزت کے نام پہ عورت کو قتل کر دینا یہ ایسے جبر ہیں جو ہمارے معاشرے کا ناسور ہیں۔ اسلام ذات پات کے خلاف ہے لیکن ہمارے معاشرے میں ذات پات کی بنیاد پر پیشوں کی تقسیم اور دوسروں کو حقیر جاننا کسی سے مخفی نہیں۔ اِس کے علاوہ جنس، مذہب، علاقے، زبان یا کسی کے مخصوص امتیاز کی بنیاد پر دوسرے سے تعصب برتنا بھی معاشرے میں عام ہے جس کو جبر کے علاوہ کسی اور نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ اِس رویے کے خلاف عام ذی شعور انسان سے لے کر شعرا اور ادیبوں کی جانب سے مزاحمت کی جاتی ہے اُردو فکشن ہو یا شاعری ہر اِک صنف میں معاشرتی جبر کے خلاف مزاحمت واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔

مزاحمت کی تاریخ، ارتقا یا روایت کے حوالے سے کوئی مخصوص عہد، علاقہ یا تحریک ایسی نہیں ہے جسے خالصتاً مزاحمت کی بنیاد یا ابتدا سے جوڑا جا سکے۔ مزاحمت ایک فطری جذبہ ہے لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کی مزاحمت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود انسان کی تاریخ۔ شکمِ مادر کا چین و راحت چھوڑ کے جہاں کی بے سکونی کا حصہ بنتے ہی پیدائش کے وقت بچے کا رونا ایک فطری عمل ہے جسے دُنیا پر حضرتِ انسان کا پہلا مزاحمتی اظہار شمار کیا جا سکتا ہے۔ مذہبی عقائد اور اساطیر کو دیکھیں تو حضرت آدمؑ کا شجرِ ممنوعہ کو ہاتھ لگانے، فرزندانِ آدم میں سے ایک بھائی کا دوسرے کو قتل کرنے، ہندی ویدک میں شنبوک کا پاک اشلوک کی تلاوت کرنے یا حضرت عیسیٰؑ کے جہاں سے اُٹھا لیے جانے کو مزاحمت سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انسان نے مِل جُل کر رہنے کا آغاز کیا تو معاشرتی زندگی نے جنم لیا۔ قبیلوں کا دوسرے کمزور قبیلوں پر حملہ کرنے اور اِس کے ردِ عمل میں اُن کی جوابی کارروائی یا اُسے روکنے کی سعی کرنا

مزاحمت ہی کی مثالیں ہیں۔ یوں معاشرتی ارتقا کو دیکھا جائے تو انفرادی اور اجتماعی سطح پر اِس کے واضح نقوش موجود ہیں۔ انسانی معاشرے کے ابتدائی دور میں اِس کی بیشتر مثالیں تاریخ کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر آغا ظفر حسنین لکھتے ہیں:

"71 ق م قدیم یونان کے پیرو سپارٹکس (Spartucs) کی قیادت میں حکومتِ روم کے خلاف غلاموں کی بغاوت تاریخ کے حافظے میں محفوظ ہے۔ اسپارٹکس نے انسانوں کا غالباً پہلا ایسا منظم گروہ تشکیل دیا جس کا نصب العین مشترک تھا اور جس نے حکومت روم کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی۔ مزاحمت کی یہی وہ بنیادی انسانی جبلت تھی جس کے زیر اثر سقراط نے زہر کا پیالہ پینا گوارا کیا مگر سچ کا دامن نہ چھوڑا۔ مزاحمت کے یہ وہ چند sporadic نمونے تھے جو اپنی ترقی یافتہ شکل میں انقلاب فرانس، انقلاب امریکہ اور انقلاب روس میں ظہور پذیر ہوئے۔"(25)

عمومی سطح پر دیکھا جائے تو انسان کے سرشت میں شامل مزاحمتی فطرت کے اظہار کی یہ ابتدائی مثالیں ہیں جو آج کے انسان کو معلوم تاریخ کا حصہ ہیں۔ عام افراد کی نسبت شاعر، ادیب، فنکار یعنی تخلیق کار لوگ حساس طبع اور اپنے ماحول کو انتہائی شدت سے محسوس کرنے والے ہوتے ہیں لہذا اُن کے ہاں اِس کا ردِ عمل بھی غیر معمولی نوعیت کا ہوتا ہے۔ رضی عابدی کہتے ہیں:

"شاعر دھرتی کی آواز میں اِس کے جادوں بھرے نغموں میں مظلوموں کی دبی دبی آہیں سنتا ہے۔"(26)

شاعر کی یہی حساس طبیعت اُس کو صدائے حق بلند کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی تخلیق کار کے ہاں کوئی بھی تخلیق کسی لمحے، کسی جذبے، کسی کیفیت کو ردو قبول کرنے کے بعد معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اِس حساب سے دیکھا جائے تو تمام ادب مزاحمتی شمار ہو گا۔

گویا انسانی طبع جب کسی شے سے انحراف کرتی ہے تو اُسے ایک محرک حاصل ہوتا ہے ایک تحریک ملتی ہے جو کسی تخلیق کار کے حصے میں آئے تو کوئی فن پارہ جنم لیتا ہے جس کو ہم اختلاف و انحراف کا مظہر یا مزاحمتی ذریعہ اظہار کہتے ہیں۔ قمر رئیس اپنے مضمون "ادب میں اختلاف، انحراف اور احتجاج کی معنویت" میں رقم طراز ہیں:

"ادب کی تخلیق اور محرکات کے بارے میں فلسفے اور نظریے اپنی جگہ لیکن ادب کی تاریخ اور عملی اطلاق پر نظر ڈالیے تو اِس حقیقت سے انکار مشکل ہو گا کہ ادب کا ایک قوی محرک اختلاف اور انحراف DISSENT کا جذبہ بھی ہے۔ حساس ادیب جب اپنے کسی معتبر تجربہ کو اظہار کی شکل دیتا ہے تو گویا وہ ایک اختلافی یا انحرافی عمل سے گزرتا ہے۔"(27)

اِس طرح ابوالکلام قاسمی اپنے ایک مضمون میں اِس حوالے سے یوں گویا ہوتے ہیں:

"شعر و ادب کی تخلیق بذاتِ خود ایک مزاحمتی عمل ہے۔اِس لیے مزاحمت کا نام لیے بغیر بھی ہر زمانے کے شعر و ادب میں اِس کی کار فرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔"(28)

لیکن اِس سب کے باجود جب ہم ادب کو مختلف رویوں، مختلف جہتوں یا مختلف تحریکوں میں منقسم کرتے ہیں تو مزاحمتی ادب اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔مزاحمتی ادب کا ایک الگ جہان ہے جس میں تخلیق شدہ نثر و نظم کو معتبر اہمیت حاصل ہے۔کسی بھی ملک، قوم یا عہد کی تاریخ مرتب کرنا ہو یا اُس کے نشیب و فراز کا بغور مطالعہ درکار ہو تو اُس عہد کا مزاحمتی ادب اِس کا ایک مستند حوالہ ہو گا۔

دنیائے عالم کے ادب کا مطالعہ کیا جائے تو کئی ادیب ایسے ہیں جن کے ہاں مزاحمت کے واضح نقوش بھرپور انداز میں دیکھے جا سکتے ہیں۔البرٹ کامیو، سارتر، موپساں، چیخوف، ٹالسٹائی، ناظم حکمت، پابلو نیرودا، محمود درویش، قراۃالعین طاہرہ اور کئی نام حوالے کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ترقی پسند ادب اور وجودیت سمیت کئی ایسی تحریکیں ہیں جن کے پیچھے مزاحمت کا جذبہ کار فرما ہے۔

حواشی و حوالہ جات

1۔سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ (جلد چہارم)،لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۶ء، ص۳۳۹

2۔ مرزا نسیم بیگ (مدیر)، اُردو لغت- تاریخی اصول پر (جلد ہفت دہم)، کراچی: اُردو لغت بورڈ، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص۹۲۷

3. Niaz Ahmad, DUNCAN FORBES DICTIONARY, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2002, P682

4۔شان الحق حقی (مترجم و مرتب)،اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۱۰

5۔شان الحق حقی (مترجم و مرتب)،اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، ص۱۳۴۱

6۔طارق کلیم،ڈاکٹر،اُردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر، کراچی: انجمنِ ترقی اردو، ۲۰۱۸ء، ص ۵۰

7۔بختیار حسین صدیقی، پروفیسر، "سارتر کی داخلیت کا خارجی پس منظر"، مشمولہ: وجودیت، مرتب: جاوید اقبال ندیم، ساہیوال: وکٹری بک بنک، ۱۹۸۹ء، ص۶۳

8۔ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۵ء، ص۱۱۸

9۔انوار احمد،ڈاکٹر، "عالمی مزاحمتی شاعری"، مشمولہ: ماہ نو، جلد: ۱۴، شمارہ: ۲۰، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۳

10۔ روبینہ سہگل، عورت اور مزاحمت، لاہور: مشعل، ۱۹۹۹ء، ص ۲۳
11۔ نعیم بیگ، ”مزاحمتی ادب اور اُس کی تشریحات“، مشمولہ: دیدبان، شمارہ ۷، مارچ ۲۰۱۸ء، ص ۲۳
(www.deedbanmagazine.com/blog/mzhmty-db-wr-skhy-tshryht)
12۔ ابرار احمد، ”مزاحمتی ادب“، مشمولہ: اُردو ادب، احتجاج اور مزاحمت کے رویے، دہلی: اُردو اکادمی، ص ۲۵
13. R.D Laing, the Politics of Experince, New York: Pantheon, 1967, P 28
14. Erich Fromm, the Sane Society, New York: Rinehart, 1955, P 37
15۔ الحاج فیروز الدین (مرتب)، فیروز اللغات اُردو، لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۵ء، ص ۷۳
16۔ ایس ایم سلیم الدین اور سہیل انجم (مولفین)، اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت، مدیر اعلیٰ: رؤف پاریکھ، کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء، ص ۱۶
17۔ محمد حسن، پروفیسر، "۔۔۔"، مشمولہ: مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری، مرتب: ڈاکٹر آغا ظفر حسنین، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2006ء، ص ۱۸
18۔ الحاج فیروز الدین (مرتب)، فیروز اللغات اُردو، ص ۲۱۷
19۔ ایس ایم سلیم الدین اور سہیل انجم (مولفین)، اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت، ص ۱۶
20۔ الحاج فیروز الدین (مرتب)، فیروز اللغات اُردو، ص ۱۳۸
21. Lexicon Universal Encyclopediya, New York: Lexicon Publications, Inc, Volume 13, 2nd Edition, P207
22۔ علی جاوید، ڈاکٹر، افہام و تفہیم، دہلی: رائٹرز گلڈ، 2000ء، ص ۴۷
23۔ آغا ظفر حسنین، مزاحمت اور پاکستانی اُردو شاعری، ص ۲۱، ۲۲
24۔ ایضاً، ص ۲۳
25۔ ایضاً، ص ۳۲
26۔ رضی عابدی، ڈاکٹر، مغربی ڈرامہ اور جدید ادبی تحریکیں، لاہور: ادارہ تالیف و ترجمہ جامعہ پنجاب، ۱۹۸۷ء، ص ۸۰
27۔ قمر رئیس، ”ادب میں اختلاف، انحراف اور احتجاج کی معنویت“، مشمولہ: اُردو ادب، احتجاج اور مزاحمت کے رویے، دہلی: اُردو اکادمی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹-۲۰
28۔ ابوالکلام قاسمی "احتجاجی ادب کے مسائل (شاعری کے حوالے سے)"، مشمولہ: اُردو ادب، احتجاج اور مزاحمت کے رویے، ص ۱۰۸

References in Roman Script:

1. Syed Ahmad Dehlvi, Farhang e Asfiya, Lahore: Urdu Science Board, Vol 4, 2006, P339
2. Mirza Naseem Baig (Editor), Urdu Lughat-Tareekhi Asool Par, Vol 17, Karachi: Urdu Lughat Board, 2000, P927
3. Niaz Ahmad, Duncan Forbes Dictionary, Lahore: Sang-e Meel Publications, 2002, P682
4. Shan Ul Haq Haqi (Mutarjim-o Muratab), Oxford English Urdu Dictionary, Karachi: Oxford University Press, 2007, P1310
5. Shan Ul Haq Haqi, (Mutarjim-o Muratab), Oxford English Urdu Dictionary, P1341
6. Tariq Kaleem, Dr, Urdu ki Zareefana Shaeri mein Muzahmati Anasir, Karachi: Anjuman Tarraqqi e Urdu, 2018, P50
7. Bakhtiar Hussain Siddiqui, Professor, “Sartar ki Dakhliyat ka Kharji Pasmanzar” Mashmoola: Wajoodiyat, Muratab: Javedd Iqbal Nadeem, Sahiwal: Victory Book Bank, 1989, P63
8. Qaisar ul Islam, Qazi, Falsfy kay Buniyadi Masaeil, Islamabad: National Book Foundation, 2015, P118
9. Anwar Ahmad, Dr, “Almi Muzahmati Shaeri”, Mashmoola: Mah e Now, Vol 14, Issue 20, Lahore, 1989, P33
10. Robina Sehgal, Awrat awr Muzahmat, Lahore: Mishal, 1999, P23
11. Naeem Baig, “Muzahmati Adab awr Uski Tashrehaat”, mashmoola: Risala Deedbaan, Issue 7, 2018, P23
12. Abrar Ahmad, “Muzahmati Adab”, mashmoola: Urdu Adab-Ahtajaj awr Muzahamat kay Raweay, Lahore: Urdu Academy, P25
13. R.D Laing, The Politics of Experience, New York: Pantheon, 1967, P28
14. Erich Fromm, The Sane Society, New York: Rinehart, 1955, P37
15. Feeroz ul Din Alhaaj (Muratab), Feeroz ul Lughaat, Lahore: Feeroz Sons, 2005, P73
16. S.M. Saleem Ul Din and Sohail Anjum (Mualifeen), Oxford Urdu English Dictionary, Editor: Rauf Pareekh, Karachi: Oxford University Press, 2013, P16
17. Agha Zafar Hussain, Dr, Muzahmat awr Pakistani Urdu Shaeri, New Delhi: Educational Publishing House, 2006, P18
18. Feeroz ul Din Alhaaj (Muratab), Feeroz ul Lughaat, P217
19. S.M. Saleem Ul Din and Sohail Anjum (Mualifeen), Oxford Urdu English Dictionary, P16
20. Feeroz ul Din Alhaaj (Muratab), Feeroz Ul Lughaat, P138
21. Lexicon Universal Encyclopediya, New York: Lexicon Publications, Inc, Volume 13, 2nd Edition, P207

22. Ali Javed, Dr, Afham O Tafheem, Delhi: Writers Gulid, P47
23. Agha Zafar Hussain, Dr, Muzahmat awr Pakistani Urdu Shaeri, P21-22
24. As Above, P23
25. As Above, P32
26. Razzi Abidi, Dr, Maghrabi Drama awr Jadeed Adabi Tehreekein, Lahore: Idara Taleef o Tarjama, Punjab University, 1987, P80
27. Qamar Raes, “Adab mein Ikhtalaf awr Ahtajaj ki Manviyat”, mashmoola: Urdu Adab, Ahtajaj awr Muzahmat kay Rawaeay, Delhi: Urdu Academy, 2004, P19-20
28. Abul Kalam Qasmi, “Ahtajaji Adab Kay Masaeil (Shaeri Kay Hawaly sy) ”, mashmoola: Ahtajaj awr Muzahmat kay Rawaeay, P108